استواء علی العرش

پیش لفظ

حضرت مولانا مفتی خالد سیف اللہ رحمانی مدظلہ

جنرل سکریٹری اسلامک فقہ اکیڈمی، انڈیا، و ناظم المعہد العالی الاسلامی، حیدرآباد

تقریظ

حضرت مولانا مفتی محمد اسلام صاحب قاسمی مدظلہ

استاذ حدیث و صدر شعبہ عربی ادب دارالعلوم دیوبند (وقف)

تصنیف

مولانا ندیم احمد انصاری

ڈائریکٹر الفلاح اسلامک فاؤنڈیشن انڈیا

ناشر

الفلاح اسلامک فاؤنڈیشن انڈیا

استواء علی العرش

تصنیف

مولانا ندیم احمد انصاری حفظہ اللہ
ڈائرکٹر الفلاح اسلامک فاؤنڈیشن انڈیا

ناشر

الفلاح اسلامک فاؤنڈیشن انڈیا

فہرستِ مضامین

پیش لفظ

حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب مدظلہ

جنرل سکریٹری فقہ اکیڈمی، انڈیا و ناظم المعہد العالی الاسلامی، حیدر آباد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اللہ تعالیٰ کا انسانیت پر عظیم احسان ہے کہ اس نے اپنی ذات اور صفات کے بارے میں ہم کو وحی کے ذریعے سے مطلع فرمایا اور اس باب میں اٹکل تیر مارنے اور خیالی گھوڑے دوڑانے سے امت محمدیہ کو محفوظ رکھا، ورنہ یہ امت بھی گذشتہ امتوں کی طرح ذات وصفات کی تعیین میں غلطیوں کا شکار ہوتی اور گمراہ ہو جاتی۔ چوں کہ باری تعالیٰ نے قرآن کریم کو عربی زبان میں انسان کی فہم کو ملحوظ رکھتے ہوئے نازل کیا ہے، اس لیے اپنی صفات کی تعبیر ایسے الفاظ میں کی ہے، جن کو انسانی (ذہن) قبول کر سکے۔ اس ضمن میں قرآن کریم میں بعض الفاظ حق سبحانہ وتقدس اسمہ کے لیے وارد ہوئے ہیں، جن سے ان کے ظاہری معنی مراد نہیں، جن کی حقیقت سے ذاتِ خداوندی ہی واقف ہے۔

ایسے الفاظ متشابہات میں داخل ہیں۔ الفاظ وآیات کے سلسلے میں اہل سنت والجماعت کے دو مسلک ہیں، ایک تفویض، دوسرے تاویل۔ تفویض کا مطلب یہ ہے کہ ان الفاظ کی مراد کو حق تعالیٰ کے سپرد کر دیا جائے اور یہ کہا جائے کہ ان سے ظاہری معنی مراد نہیں اور اس کی حقیقت کا علم اللہ تعالیٰ (ہی) کو ہے۔ ان کی کیفیت کے متعلق سوال کیے بغیر ان پر ایمان لانا واجب ہے۔

تاویل سے مراد یہ ہے کہ: کیوں کہ ان کے ظاہر کا حق سبحانہ کی ذات پر اطلاق نہیں کر سکتے، اس لیے ان الفاظ کے ظاہری معنی مراد نہیں، بلکہ مجازی طور پر ان کو صفات الٰہی کے بیان کے لیے لایا گیا ہے۔ مثلاً: 'ید' سے قدرت، نصرت، معیت مراد ہے۔ 'قرب' سے عزت واکرام اور 'بعد' سے ذلت واہانت مراد ہے۔ 'نزول' سے رحمت خداوندی کا متوجہ ہونا مراد ہے، وغیرہ۔ البتہ! دونوں فریق اس بات پر متفق ہیں کہ ان مسائل میں بلا ضرورت کھوج کرید کرنا اور ان کے سلسلہ میں بحث ومباحثہ کرنا بدعت اور سخت منع ہے۔ خصوصاً آج کے دور میں، جب کہ امت شدید حالات سے دوچار اور تاریخ کے اہم موڑ پر کھڑی ہے، ایسے وقت میں ذات وصفات کے مسائل میں امت کو الجھانا اور ان کی صلاحیتوں اور توانائیاں صَرف کرنا ناعاقبت اندیشی ہے۔

محب گرامی مولانا ندیم احمد انصاری صاحب نے بعض حلقوں کی جانب سے اٹھائے جانے والے مسائل کو سامنے رکھ کر اس رسالہ کو مرتب کیا ہے اور اس میں اہل سنت والجماعت کے دونوں مسلکوں کی وضاحت کی ہے۔ دعا ہے کہ باری تعالیٰ اس کو نافع بنائے اور ان کی صلاحیتوں میں اضافہ فرمائے۔ آمین

۲۳ر ذیقعدہ ۱۴۳۴ھ خالد سیف اللہ رحمانی

۲ر اکتوبر ۲۰۱۳ء المعہد العالی الاسلامی، حیدرآباد

تقریظ

حضرت مولانا محمد اسلام صاحب قاسمی مدظلہ

محدِّث وصدر شعبۂ عربی ادب، دارالعلوم دیوبند وقف

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم

اہل سنت والجماعت کا عقیدہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اپنی ذات میں واحد ہے، جس کا کوئی شریک نہیں اور وہ تمام نقائص وعیوب، حدوث وامکان کے شوائب سے پاک اور منزہ ہے، اس کی ذات جواہر واجسام کی صافت اور لوازم سے مبرأ ومنزہ ہے، اس کی بارگاہ میں مکان وزمان اور جہت کی گنجائش نہیں، یہ سب اس کی مخلوق ہیں۔

مگر قرآن کریم میں اللہ کی ذات کے سلسلے میں مختلف آیتوں میں ''الرحمن علی العرش استویٰ'' کے مفہوم پر مشتمل ذکر ہے، جس کا مطلب ہے کہ وہ بڑی رحمت والا عرش پس استواء فرمائے ہوئے ہے، اس مفہوم سے بظاہر یہ متبادر ہوتا ہے کہ استواء علی العرش کیلئے جسم لازم ہے، جس سے اللہ کی ذات قطعی پاک ہے۔

اس سلسلے میں علمائے اہل سنت اور مفسرین نے بڑی وضاحتیں پیش کی ہیں، امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے یہی سوال ہوا تو انھوں نے ارشاد فرمایا: استواء کا مطلب تو

معلوم ہے لیکن اس کی کیفیت عقل میں آنے والی نہیں، اس پر ایمان لانا واجب ہے اور اس کے بارے میں سوال کرنا بدعت ہے، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان القرآن میں لکھا ہے کہ ''سلف کا مذہب ایسے نصوص میں مراد کی تفویض حق سبحانہ وتعالیٰ کی طرف ہے، یعنی جو استواء حق تعالیٰ نے مراد لیا ہے اور وہ حق تعالیٰ کی شان کے موافق ہے وہی مراد ہے۔'' حاصل یہ کہ استواء علی العرش سے اللہ تعالیٰ کی شان کے مطابق قیام مراد ہے اور اس کے ذکر سے حق تعالیٰ کی علو شان اور بے مثال رفعت کو بیان کرتا ہے۔

اس موضوع پر علمائے اہل سنت والجماعت کا مسلک اور اس کی تشریح ہی دراصل پیش نظر کتاب کا حاصل ہے جس کو جناب مولانا ندیم احمد صاحب نے مرتب کیا ہے، ان کی علمی اور اصلاحی کوششوں کا ہی یہ ایک سلسلہ ہے، اس سے پہلے بھی کئی رسالے اور کتابیں مرتب کر کے شائع کر چکے ہیں، دعا ہے کہ اللہ ان مخلصانہ عمل اور کوششوں کو مقبولیت اور مزید توفیق عطا فرمائے۔ آمین

محمد اسلام قاسمی

استاذ حدیث وادب دار العلوم وقف دیوبند

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اللہ تعالیٰ کے متعلق عقیدہ

حق تعالیٰ تمام نقائص اور عیوب اور حدوث اور امکان کے شوائب اور نشانوں سے منزہ اور مبرا ہے۔ نہ جسم اور جسمانی ہے اور نہ مکانی و زمانی۔ اس کی ذات جواہر واجسام واعراض کی صفات اور لوازم سے پاک اور منزہ ہے۔ اس کی بارگاہ میں مکان وزمان اور جہت کی گنجائش نہیں، یہ سب اس کی مخلوق ہیں۔

حق تعالیٰ کسی چیز کے ساتھ متحد نہیں ہوتا اور نہ کوئی چیز اس کے ساتھ متحد ہوتی ہے اور نہ کوئی چیز اس میں حلول کرتی ہے، اور نہ وہ کسی شیٔ میں حلول کرتا ہے۔(۱)

حق سبحانہ کی حقیقت وجودِ محض ہے کہ اور کوئی امر اس کے ساتھ ملا ہوا نہیں ہے اور وہ وجود تعالیٰ ہر چیز وکمال کا منشا اور ہر حسن وجمال کا مبدأ ہے اور جزئی حقیقی اور بسیط ہے، جس کی طرف ترکیب کو گزر راہ نہیں ہے۔ نہ ذہنی طور پر نہ خارجی طور پر اور حقیقت کے اعتبار سے اس کا تصور میں آنا محال ہے۔(۲)

علامہ نسفیؒ کا فرمان

(۱) عقائد الاسلام: ۱/۳۱، فرید بکڈپو، دھلی

(۲) مکتوبات امام ربانی، حصہ چہارم، دفتر اول: ۱/۳۸

عرضِ مؤلف

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم، امابعد:

قرآن کریم --- اللہ سبحانہ تعالیٰ کی تنزیہ سے بھرا ہوا ہے، اس کے بعد بھی بہت سے لوگ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے ساتھ جسم، جہت اور کمیت وغیرہ کو منسوب کرنے کے در پہ رہتے ہیں، جو کہ سراسر گمراہی ہے۔ بندے کی نہ یہ اوقات ہے اور نہ ہی وہ اس کے مجاز ہیں کہ خالق کائنات کی ذات میں غور و کریں۔ پھر آج کی دنیا میں --- جب کہ انسانی زندگی رنت نئی کشمکش سے دوچار ہے --- کسی طرح مناسب نہیں کہ عوام میں علمِ کلام کی بحثوں کو چھیڑا جائے، لیکن کیا کیجیے کہ بعض لوگوں نے اسے ہی اپنا مشن بنا لیا ہے اور اس کے ذریعہ وہ خوش گوار فضا کو آلودہ اور موسم میں گرمی پیدا کرنا چاہتے ہیں، تا کہ اس طرح عوام کو متذبذب کر کے وہ انھیں اپنے کانفڈنس میں لے سکیں۔

ایسے ہی ناعاقبت اندیشوں کی طرف سے آج کل رہ رہ کر --- استویٰ علی العرش --- کا مسئلہ بھی زیر بحث لایا جاتا ہے اور عوام صحیح اور مکمل علم نہ ہونے کی بنا پر شبہات یا غلط فہمی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ مسئلہ واقعی نازک ہے، اسی لیے صحابہ کرامؓ اور ائمۂ عظام نے بھی عموماً اس مسئلہ میں سکوت کو پسند فرمایا ہے۔ ہمیں اپنے معاصرین کی بعض ''کرم فرمائیوں'' نے اس اہم موضوع پر قلم اٹھانے پر مجبور کیا، تو بنام خدا ہم نے

متقدمین ومتأخرین کے اقوال کی روشنی میں یہ ایک جامع رسالہ تحریر کیا۔ جو اکابر علماء کی نظر سے گزر کر آپ تک پہنچا ہے۔ تمام باتیں باحوالہ ہیں۔ امید کہ کہیں کوئی الجھاؤ بھی محسوس نہیں ہوگا اور اگر واقعی خلوص کے ساتھ اس کا مطالعہ کیا گیا تو بہت سے شبہات دور ہو جائیں گے۔

اخیر میں دست بدعا ہوں کہ وہ کریم ذات ہمیں ایمان پر جمائے رکھے، نیک ہدایت سے نوازتا رہے۔ ایمان کے ساتھ اس دنیا سے جانا مقدر فرمائے۔ ہماری اس محنت کو شرف قبول عطا فرمائے، اسے امت کی اصلاح کا ذریعہ بنائے مؤلف، اس کے والدین محترمین، اعزہ واقارب، اساتذہ وتلامذہ نیز تمام معاونین وقارئین کے حق میں صدقۂ جاریہ بنائے۔ آمین یارب العالمین

العبد ندیم احمد انصاری عفا اللہ عنہ

خادم الفلاح اسلامک فاؤنڈیشن، انڈیا

ومدرسہ نور محمدی، ممبئی

علامہ نسفی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

والمحدث للعالم هو الله تعالیٰ، الواحد، القديم، الحي، القادر، العليم، السميع، البصير، الشائي المريد، ليس بعرض، ولا جسم، ولا جوهر، ولا مصور، ولا محدود، ولا معدود، ولا متبعض، ولا متجز، ولا متركب، ولا متناه، ولا يوصف بالماهية، ولا بالكيفية ولا يتمكن في مكان، ولا يجري عليه زمان، ولا يشبهه شيء، ولا يخرج عن علمه وقدرته شيء۔ وله صفات أزلية قائمة بذاته، وهي لا هو، ولا غيره.

عالم کو وجود عطا کرنے والی ذات اللہ تعالیٰ کی ہے، جو کہ واحد ہے، قدیم ہے، ہمیشہ زندہ رہنے والا ہے، قدرت والا ہے، جاننے والا ہے، سننے والا ہے، دیکھنے والا ہے، چاہنے والا ہے، ارادہ کرنے والا ہے، نہ وہ عرض ہے نہ جسم، نہ جوہر ہے اور نہ اس کی کوئی شکل وصورت ہے، نہ محدود ہے اور نہ معدود (جس کو شمار کیا جاسکے) نہ حصوں کی شکل میں ہے، نہ جزء کی صورت میں، نہ مرکب ہے نہ متناہی، نہ اسے ماہیت کے ساتھ بیان کیا جاسکتا ہے، نہ کیفیت کے ساتھ، نہ وہ کسی مکان میں متمکن ہے، نہ ہی کوئی زمانہ اس پر جاری ہے-- کوئی چیز بھی اس سے مشابہت نہیں رکھتی اور کوئی چیز بھی اس کی قدرت اور اس کے علم سے خارج نہیں۔

اس کی تمام صفات ازلی ہیں، جو اس کی ذات سے قایم ہیں اور یہ صفات نہ ہی وہ (ذاتِ حق) ہے، نہ ہی اس کا غیر ہیں۔

علامہ غزالیؒ کا فرمان

امام غزالی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

الذات: المعرف إياهم أنه في ذاته واحد لا شريك له، فرد لا مثيل له،

---

(۱) العقیدۃ النفسیۃ: ۱-۳-۵، مکتبہ بلال، دیوبند

صمد لا ضد له، منفرد لا ندله، وأنه واحد قديم لا أول له، أزلی لا بداية له، مستمر الوجود لا آخر له، أبدی لا نهاية له، قيوم لا انقطاع له دائم لا انصرام له، لم يزل ولا يزال موصوفاً بنعوت الجلال لا يقضى عليه بالانقضاء والانفصال بتصرم الآباد وانقراض الآجال بل {هو الأول والآخر والظاهر والباطن وهو بكل شیء عليم}

بے شک اللہ تعالیٰ اپنی ذات میں واحد ہے، جس کا کوئی شریک نہیں، یکتا ہے، جس کی کوئی مثل نہیں، بے نیاز ہے، جس کی ضد نہیں، منفرد ہے، جس کی مانند کوئی نہیں، وہ ایسا واحد اور قدیم ہے، جس سے اوّل کوئی نہیں، وہ ازل سے ہے، جس کی کوئی ابتداء نہیں، اس کا وجود ہمیشہ باقی رہنے والا ہے، جس کا کوئی آخر نہیں، وہ ابدی ہے، جس کی کوئی انتہا نہیں، وہ ہمیشہ باقی رہنے والا ہے، جس کا کوئی انقطاع نہیں، وہ جلالت کی صفت سے متصف ہے، مدتوں کے خاتمہ اور زمانوں کی ہلاکت کے باعث، اس فنائیت اور انجام کے سبب اس کے خلاف فیصلہ نہیں ہو سکتا، بلکہ وہی اول ہے، وہی آخر ہے، وہی ظاہر ہے، وہی باطن ہے اور وہی ہر چیز کا جاننے والا ہے۔

التنزيه: وأنه ليس بجسم مصور ولا جوهر محدود مقدر، وأنه لا يماثل والأجسام لا في التقدير ولا في قبول الانقسام، وأنه ليس بجوهر ولا تحله الجواهر، ولا بعرض ولا تحله الأعراض، بل لا يماثل موجودا ولا يماثله موجود، {ليس كمثله شیء} ولا هو مثل شیء، وأنه لا يحده المقدار ولا تحويه الأقطار، ولا تحيط به الجهات، ولا تكتنفه الأرضون والسماوات، وأنه مستو على العرش، على الوجه الذی قاله وبالمعنى الذی أراده، استواء منزهاً عن المماسة والاستقرار والتمكن والحلول والانتقال، لا يحمله العرش بل العرش وحملته محمولون بلطف قدرته ومقهورون في قبضته، وهو فوق العرش والسماء وفوق كل شیء إلى تخوم الثرى، فوقية لا تزيده قرباً إلى

العرش والسماء، كما لا تزيده بعدا عن الأرض والثرى، بل هو رفيع الدرجات عن العرش والسماء، كما أنه رفيع الدرجات عن الأرض والثرى، وهو مع ذلك قريب من كل موجود وهو أقرب إلى العبد من حبل الوريد، {وهو على كل شيء شهيد} إذ لا يماثل قربه قرب الأجسام كما لا تماثل ذاته ذات الأجسام، وأنه لا يحل في شيء ولا يحل فيه شيء، تعالى عن أن يحويه مكان كما تقدس عن أن يحده زمان، بل كان قبل أن خلق الزمان والمكان وهو الآن على ما عليه كان، وأنه بائن عن خلقه بصفاته ليس في ذاته سواه ولا في سواه ذاته، وأنه مقدس عن التغيير والانتقال، لا تحله الحوادث ولا تعتريه العوارض، بل لا يزال في نعوت جلاله منزها عن الزوال وفي صفات كماله مستغنياً عن زيادة الاستكمال، وأنه في ذاته معلوم الوجود بالعقول، مرئي الذات بالأبصار نعمة منه ولطفاً بالأبرار في دار القرار، وإتماماً منه للنعيم بالنظر إلى وجهه الكريم.

بے شک! وہ جسم سے پاک ہے، اس کی تصویر کشی نہیں کی جا سکتی، نہ وہ محدود جوہر ہے جس کا اندازہ کیا جا سکے۔ وہ اجسام سے مماثلت نہیں رکھتا، نہ مقدار میں اور نہ قبولِ تقسیم میں۔ وہ جوہر نہیں ہے اور نہ ہی جواہر اس میں حلول کر سکتے ہیں۔ وہ عرض نہیں ہے اور نہ ہی اعراض اس میں حلول کر سکتے ہیں، یعنی وہ جوہر و عرض سے پاک ہے، بلکہ وہ کسی موجود کے مماثل نہیں اور نہ ہی کوئی موجود اس کے مماثل ہو سکتا ہے۔ کوئی چیز اس کے مثل نہیں اور نہ ہی وہ کسی چیز کے مثل ہے۔ مقدار اس کی حد بندی نہیں کر سکتی، اطراف اسے سمیٹ نہیں سکتے، جہات اس کا احاطہ نہیں کر سکتیں، وہ مکان و جہت سے پاک ہے، سب آسمان اور زمینیں اس کو گھیر نہیں سکتے، وہ اسی طرح اپنے عرش پر مستوی ہے، جیسا کہ اس نے فرمایا ہے، اس معنی کے ساتھ جس کا اس نے ارادہ کیا ہے، اس کا یہ استواء فرمانا چھونے سے، قرار پکڑنے سے، تمکن و حلول اور

(۱) قواعد العقائد للغزالی: ۱-۲

انتقال سے منزہ ہے۔ عرش اس کو نہیں اٹھاتا، بلکہ عرش اور اس کو اٹھانے والے اس کے لطف وقدرت کے سبب اٹھے ہوئے ہیں اور اس کے قبضۂ قدرت میں بے بس ہیں۔ وہ (ذات تو) عرش وسماء سے بلند ہے، اور تحت الثریٰ تک ہر چیز پر فوق اور برتر ہے، یہ بلندی اس کے عرش اور آسمان تک کے قرب میں کچھ اضافہ نہیں کرتی۔ جس طرح کہ وہ زمین و پاتال تک سے اسے دور نہیں کرتی، بلکہ وہ عرش وسماء سے بلند مرتبہ ہے، جس طرح کہ وہ زمین وثریٰ سے بلند مرتبہ ہے، اس کے ساتھ ساتھ وہ ہر موجود سے قریب ہے، وہ بندے کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے، وہ ہر چیز پر نگہبان ہے، کیونکہ اس کا قرب اجسام کے قرب جیسا نہیں ہے، جس طرح کہ اس کی ذات اجسام کی ذاتوں جیسی نہیں ہے، بے شک وہ کسی چیز میں حلول نہیں کرتا، اور نہ کوئی چیز اس میں حلول کر سکتی ہے۔ وہ اس سے بلند ہے کہ مکان اسے گھیر سکے، جس طرح وہ اس سے پاک ہے کہ زمانہ اس کا احاطہ کر سکے، بلکہ وہ تو زمان ومکان کی تخلیق سے پہلے بھی تھا، وہ اب بھی اپنی اسی ازلی صفت پر قایم ہے، وہ اپنی مخلوق سے اپنی صفات کے اعتبار سے جدا ہے، اس کی ذات میں اس کے علاوہ کوئی نہیں اور نہ اس کے غیر میں اس کی ذات ہے۔ وہ تغیر وانتقال سے پاک ہے، حوادث اس میں داخل اور عوارض اس کو لاحق نہیں ہو سکتے، بلکہ وہ اپنی صفاتِ جلال میں ہمیشہ پاک رہے گا اور اپنی کمال صفات میں وہ قبولِ اضافہ سے مستغنی ہے، (ایسا نہیں کہ کوئی چیز اس کے کمال میں اضافہ کرتی ہو، اس لیے کہ وہ تو ازل سے تمام کمالات سے متصف ہے)۔ یہ عقل ودانش کے سبب وہ اپنی ذات میں وجودِ عالم ہے، آنکھوں سے دکھائی دینے والی ذات ہے، دارِ آخرت میں یہ اس کی طرف سے نعمت اور نیکوکاروں کے لیے انعام ہوگا اور اس کی طرف سے اس نعمت کا اتمام وکمال اس کے حسین وجمیل چہرے کی زیارت پر ہوگا۔ (یعنی قیامت میں وہ جیسا چاہے گا اپنے بندوں کو اپنی زیارت کے شرف سے

مشرف فرمائے گا)

اب آگے اصل موضوع کا ذکر آتا ہے۔

قرآن کریم میں استویٰ کا ذکر

قرآنِ کریم میں سات مقامات پر استویٰ علی العرش کا ذکر ہے:

(۱) {اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ} (۱)

یقیناً تمھارا پروردگار وہ اللہ ہے، جس نے سارے آسمان اور زمین چھ دنوں میں بنائے، پھر اس نے عرش پر استویٰ فرمایا۔(۲)

(۲) {اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ} (۳)

حقیقت یہ ہے کہ تمھارا پروردگار اللہ ہے، جس نے سارے آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پیدا کیا، پھر اُس نے عرش پر استویٰ فرمایا۔(۴)

(۳) {اَللّٰهُ الَّذِيْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ} (۵)

اللہ وہ ہے جس نے ایسے ستونوں کے بغیر آسمانوں کو بلند کیا، جو تمھیں نظر آسکیں، پھر اس نے عرش پر استویٰ فرمایا۔(۶)

(۴) {اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى} (۷)

---

(۱)سورۃ الأعراف:۵۴　(۲)توضیح القرآن:۴۵۹-۴۶۰

(۳)سورۃ یونس:۳　(۴)توضیح القرآن:۶۳۱

(۵)سورۃ الرعد:۲　(۶)توضیح القرآن:۷۵۳

(۷)سورۃ طٰہٰ:۵　(۸)توضیح القرآن:۹۵۵

وہ بڑی رحمت والا، عرش پر استویٰ فرمائے ہوئے ہے۔(۸)

(۵){ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ مَا بَیْنَهُمَا فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ } (۱)

وہ ذات جس نے چھ دن میں سارے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا، پھر اس نے عرش پر استویٰ فرمایا۔(۲)

(۶){ اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ مَا بَیْنَهُمَا فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ } (۳)

اللہ وہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو اور ان کے درمیان ساری چیزوں کو چھ دن میں پیدا کیا، پھر اس نے عرش پر استویٰ فرمایا۔(۴)

(۷){ هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ }۔(۵)

وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پیدا کیا، پھر عرش پر استویٰ فرمایا۔(۶)

استویٰ کے معنی

اللہ تعالیٰ کا ارشادِ عالی ہے:

{ اَلرَّحْمٰنُ عَلَی الْعَرْشِ اسْتَوٰی }۔(۷)

وہ بڑی رحمت والا عرش پر استواء فرمائے ہوئے ہے۔(۸)

---

(۱)سورۃ الفرقان:۵۹ (۲)توضیح القرآن:۱۱۰۱

(۳)سورۃ السجدۃ:۴ (۴)توضیح القرآن:۱۲۶۹

(۵)سورۃ الحدید:۴ (۶)توضیح القرآن:۱۶۷۴

(۷)سورۃ طٰہٰ:۵ (۸)توضیح القرآن:۹۵۵

علامہ راغب اصفہانی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

قال: { اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى } وقيل معناه استوىٰ له ما في السمٰوات وما في الأرض أي استقام الكل على مراده بتسوية الله إياه كقوله {ثم استوىٰ إلى السماء فسواهن} وقيل معناه استوىٰ كل شيء في النسبة إليه فلا شيء أقرب إليه من شيء إذ كان تعالىٰ ليس كالأجسام الحالة في مكان دون مكان، وإذا عدّي بإلى اقتضى معنى الانتهاء إليه إما بالذات أو بالتدبير، وعلى الثاني قوله {ثم استوىٰ إلى السماء وهي دخان} (۱) وفي الجلالين: قوله استواء يليق به هذه طريقة السلف الذين يفوضون علم المتشابه الله تعالىٰ. (۲)

اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى کے معنی یہ ہیں کہ آسمان وزمین کی تمام اشیاء اس کے مساوی ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ کے تمام چیزوں کو بنانے سے، سب اس کے ارادہ کے مطابق ٹھیک اور درست ہو گئی ہیں۔

جیسا کہ ارشاد ہے:

{ ثُمَّ اسْتَوٰۤى اِلَى السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ }۔ (۳)

پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا، چنانچہ ان کو ٹھیک ٹھیک بنادیا۔ (۴)

بعض نے آیت { اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى } کے معنی یہ بیان کیے ہیں کہ تمام چیزوں کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف مساوی ہے۔ کوئی چیز ایسی نہیں ہے، جس کے متعلق یہ کہہ سکیں کہ یہ چیز بنسبت دوسری چیز کے، اللہ تعالیٰ کے زیادہ قریب ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کو اجسام پر قیاس نہیں کر سکتے، جو ایک جگہ موجود ہوتے ہیں، دوسری جگہ نہیں ہوتے۔ نیز جب یہ لفظ { استویٰ } متعدی بـ إلی ہو، تو اس کے معنی کسی چیز تک بالذات یا بالتدبیر پہنچنے کے ہوتے ہیں اور اس ارشاد:

(۱) معجم مفردات الفاظ القرآن: ۲۸۱-۲۸۲　(۲) حاشیۃ علی الجلالین: ۱۳۳
(۳) سورۃ البقرۃ: ۲۹　(۴) توضیح القرآن: ۵۳
(۵) سورۃ فصلت: ۱۱　(۶) توضیح القرآن: ۱۴۵۶

{ ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ وَهِيَ دُخَانٌ } (۵)

پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا، جب کہ وہ (آسمان) اس وقت دھویں کی شکل میں تھا۔(۶)

یہاں دوسرے معنی یعنی تدبیر کرنا مراد ہیں۔

استواء کے مختلف معنی

'استواء' عربی زبان کا لفظ ہے، جس کے معنی ہیں: 'سیدھا ہونا' 'قایم ہونا' 'قابو پانا' اور بعض اوقات اس کے معنی بیٹھنے کے بھی ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ چونکہ جسم اور مکان سے پاک ہے، اس لیے اللہ کی ذات کے لیے استواء کے یہ معنی سمجھنا صحیح نہیں ہیں کہ جس طرح کوئی انسان تخت پر بیٹھتا ہے، اسی طرح (معاذ اللہ) اللہ تعالیٰ بھی عرش پر بیٹھے ہیں۔

'استواء' اللہ تعالیٰ کی ایک صفت ہے اور جمہور اہلِ سنت کے نزدیک اس کی ٹھیک ٹھیک کیفیت اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ اسے متشابہات میں شمار کیا گیا ہے، جن کی کھود کرید میں پڑنے کو قرآن کریم نے منع فرمایا ہے۔(۱)

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

{ هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ } (۲)

(اے رسول!) وہی اللہ ہے جس نے تم پر کتاب نازل کی ہے، جس کی کچھ آیتیں تو محکم ہیں، جن پر کتاب کی اصل بنیاد ہے اور کچھ دوسری آیتیں متشابہ ہیں۔

اس آیت کو سمجھنے کے لیے پہلے اس حقیقت کا احساس ضروری ہے کہ اس کائنات کی بے شمار چیزیں ایسی ہیں، جو انسان کی سمجھ سے بالاتر ہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا

---

(۱) توضیح القرآن: ۳۶۰ (۲) سورۂ آلِ عمران: ۷

وجود اور اس کی وحدانیت تو ایک ایسی حقیقت ہے، جو ہر انسان اپنی عقل سے معلوم کر سکتا ہے، لیکن اس کی ذات اور صفات کی تفصیلات انسان کی محدود عقل سے ماورا ہیں۔ قرآنِ کریم نے جہاں اللہ تعالیٰ کی ان صفات کا ذکر فرمایا ہے، ان سے اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ اور حکمتِ بالغہ ظاہر کی گئی ہے، لیکن کوئی شخص ان صفات کی حقیقت اور کُنہ کی فلسفیانہ کھوج میں پڑ جائے تو حیرانی یا گمراہی کے سوا اسے کچھ ہاتھ نہیں آئے گا، کیونکہ وہ اپنی محدود عقل سے اللہ تعالیٰ کی لامحدود صفات کا احاطہ کرنے کی کوشش کر رہا ہے، جو اس کے ادراک سے باہر ہے۔

قدرت جو ہے خدا کی، وہ آ ہی نہیں سکتی
عقلِ بشر، فہمِ بشر، ادراکِ بشر میں

مثلاً قرآنِ کریم نے کئی مقامات پر فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ایک عرش ہے اور یہ کہ وہ اس عرش پر مستوی ہوا۔ اب یہ بات کہ وہ عرش کیسا ہے؟ اس پر اللہ تعالیٰ کے مستوی ہونے کا کیا مطلب ہے؟ یہ وہ سوالات ہیں، جن کا جواب انسان کی عقل اور سمجھ سے بالاتر ہے اور انسان کی زندگی کا کوئی عملی مسئلہ اس پر موقوف بھی نہیں۔ ایسی آیات جن میں اس قسم کے حقائق بیان کیے گئے ہیں اور جنھیں حروفِ مقطعات کہا جاتا ہے، وہ بھی متشابہات میں داخل ہیں۔ ان کے بارے میں قرآنِ کریم نے اس آیت میں یہ ہدایت دی ہے کہ ان کی کھود کرید میں پڑنے کے بجائے ان پر اجمالی طور سے ایمان رکھ کر ان کا صحیح مطلب اللہ تعالیٰ کے حوالے کرنا چاہیے۔ اس کے برعکس قرآن کریم کی دوسری آیتیں ایسی ہیں، جن کا مطلب واضح ہے اور در حقیقت وہی آیات ہیں، جو انسان کے لیے عملی ہدایات فراہم کرتی ہیں، انھیں آیات کو ''محکم'' آیتیں کہا گیا ہے، ایک مومن کو انھیں پر خصوصی توجہ دینی چاہیے۔ متشابہات کے بارے میں صحیح طرزِ عمل بتلانا یوں بھی ضروری تھا، لیکن اس سورۂ آلِ عمران میں اس کی وضاحت کی خاص وجہ یہ

بھی تھی کہ نجران کے عیسائیوں کا جو وفد آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آیا تھا، اس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے خدا یا خدا کا بیٹا ہونے پر ایک دلیل یہ بھی پیش کی تھی کہ خود قرآن نے انہیں {کلمۃ اللہ} اللہ کا کلمہ اور {روح من اللہ} فرمایا ہے، جس سے واضح ہوتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی صفتِ کلام اور اللہ تعالیٰ کی روح تھے۔ اس مذکرہ آیت نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ قرآن کریم نے جگہ جگہ صاف لفظوں میں بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کوئی اولاد نہیں ہو سکتی، اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا یا خدا قرار دینا شرک اور کفر ہے۔ ان واضح آیتوں کو چھوڑ کر {کلمۃ اللہ} کے لفظ کو پکڑ بیٹھنا اور اس کی بنیاد پر ایسی تاویلیں کرنا جو قرآن کریم کی محکم آیات کے بالکل برخلاف ہیں، دل کے ٹیڑھ کی علامت ہے۔ حقیقت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو {کلمۃ اللہ} کہنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ باپ کے واسطے کے بغیر اللہ تعالیٰ کے کلمہ "کُن" سے پیدا ہوئے تھے۔ (جیسا کہ قرآن کریم نے سورۂ آل عمران کی آیت: ۵۹) میں بیان فرمایا ہے۔ اور انہیں {روح من اللہ} اس لیے کہا گیا ہے کہ ان کی روح براہِ راست اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمائی تھی۔ اب یہ بات انسان کی سمجھ سے بالاتر ہے کہ "کُن" سے پیدا کرنے کی کیفیت کیا تھی؟ اور براہِ راست ان کی روح کس طرح پیدا کی گئی؟

یہ امورِ متشابہات میں سے ہے، اس لیے ان کی کھود کرید بھی منع ہے (کیونکہ یہ باتیں انسان کی سمجھ میں آ ہی نہیں سکتیں) اور ان کی من مانی تاویل کر کے ان سے خدا کے بیٹے کا تصور برآمد کرنا بھی کج فہمی ہے۔(۱) بس یہی حال {استواء علی العرش} کا بھی ہے۔

چنانچہ اس کا کوئی بھی ترجمہ کرنا مغالطہ پیدا کر سکتا ہے۔ اسی بنا پر ہم نے موضوع

---

(۱) توضیح القرآن: ۱۸۲-۱۸۳ (۲) توضیح القرآن: ۲۶۰ بتغیر

سے متعلق مذکورہ بالا آیتوں کا ترجمہ نہیں کیا۔ نہ اس پر کوئی عملی مسئلہ ہی موقوف ہے۔ اتنا ایمان رکھنا کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی شان کے مطابق استواء فرمایا۔ حقیقت ہماری محدود عقل کے ادارک سے باہر ہے۔ (۲)

اہلِ سنت والجماعت کا موقف

جب باری تعالیٰ کے جسم اور جہت وغیرہ سے پاک ہونے پر دلائلِ عقلیہ قائم ہیں، تو قاعدہ یہ ہے کہ اگر کسی نص کے ظاہری الفاظ کسی ایسی چیز پر دلالت کریں، جو خلافِ عقل ہے، تو نص کے ظاہری معنی مراد نہیں ہوں گے۔ چنانچہ اہل سنت والجماعت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ جن نصوص کے ظاہری الفاظ باری تعالیٰ کے جسم اور جہت وغیرہ ہونے پر دلالت کرتے ہیں اور جو نصوص متشابہات کہلاتے ہیں، ان کے ظاہری معنی مراد نہیں ہیں۔ پھر اہل سنت والجماعت میں دو مذہب ہو گئے۔ ایک مذہب متقدمین کا، دوسرا متاخرین کا۔ (۱)

اختلاف کی بنیاد

اختلاف کی بنیاد یہ ہے کہ متشابہات کے بارے میں وارد آیتِ قرآنی:

{وَ مَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗۤ اِلَّا اللّٰهُ ۘ وَ الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا الاٰية}. (۲)

اور جن لوگوں کا علم پختہ ہے، وہ یہ کہتے ہیں کہ: ہم اس (مطلب) پر ایمان لاتے ہیں (جو اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے)۔ (۳)

میں ایک قرأت کے مطابق {اِلَّا اللّٰهُ} پر وقف ہے اور {وَالرّٰسِخُوْنَ} سے

(۱) بیان الفوائد: ۱/۱۹۷ (۲) سورۃ آل عمران: ۷

(۳) توضیح القرآن: ۱۸۴

دوسرا جملہ شروع ہو رہا ہے۔

اس قرأت کی تائید حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے (ویقول الراسخون) پڑھنے سے بھی ہوتی ہے۔ جس کی وجہ سے {الراسخون} کے {اللہ} پر معطوف ہونے کا احتمال ہو جاتا ہے۔ اس صورت میں آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ متشابہات کی تاویل اور ان کا مطلب اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے، بندوں کو ان کا علم نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ متقدمین نے اسی قرأت کو بنیاد بنا کر متشابہات کا علم اللہ تعالیٰ کے حوالہ کیا، اور جہاں بھی ان کے سامنے متشابہ نص آئی، جس سے باری تعالیٰ کے لیے جہت یا جسمیت وغیرہ سمجھ میں آتی ہو، وہاں وہ؛

اللہ أعلم بمرادہ بذالک

اس لفظ کی مراد اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے؛ کہہ کر گزر گئے۔

یہ حضرات یہ بھی کہتے ہیں کہ ید اور رجل اور اصبع اور وجہ وغیرہ تمام وہ الفاظ جو نصوص میں باری تعالیٰ کی طرف مضاف ہو کر آئے ہیں، وہ سب اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں، جن کی کنہ اور حقیقت سے ہم واقف نہیں۔

دوسری قرأت میں ﴿إلا اللہ﴾ پر وقف نہیں ہے۔ اس صورت میں {الراسخون فی العلم} کا لفظ {اللہ} پر عطف ہوگا اور آیت کے یہ معنی ہوں گے کہ متشابہات کی تاویل کا علم اللہ کو اور علماءِ راسخین کو ہے۔ چونکہ متأخرین کے زمانہ میں مذاہبِ باطلہ رواج پا چکے تھے اور مشبہ اور مجسمہ نصوصِ متشابہات کے ظاہری الفاظ کا سہارا لے کر ضعفاءِ مسلمین اور کوتاہ علم لوگوں کو گمراہ کر رہے تھے۔ اس وجہ سے انھوں نے دین کی حفاظت اور عامۃ المسلمین کو گمراہی سے بچانے کے لیے دوسری قرأت کے موافق {الراسخون فی العلم} کا لفظ {اللہ} پر عطف مان کر علماءِ راسخین کے لیے بھی متشابہات کی تاویل کا علم جائز اور ممکن قرار دیا اور متشابہات کی

مناسب تاویلات کیں، جو کتبِ تفاسیر اور شروحِ احادیث میں مذکور ہیں۔

جب علماءِ اہل سنت والجماعت کے یہ دو مذہب ہمارے سامنے آگئے، تو اب ہمارے لیے جائز ہے کہ ہم متقدمین اہل سنت والجماعت کی طرح نصوص متشابہات کا علم خدا کے حوالہ کریں، اور اللہ اعلم بالصواب کہہ کر خاموش ہو جائیں اور یہ بھی جائز ہے کہ متاخرین کی طرح ان نصوصِ متشابہات کی مناسب تاویل کریں۔(۱)

مفسرین کے نزدیک استواء کی حقیقت

حضرت علامہ عماد الدین ابن کثیر علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

وأما قوله تعالى {ثم استوى على العرش} فللناس في هذا المقام مقالات كثيرة جداً، ليس هذا موضع بسطها، وإنما نسلك في هذا المقام مذهب السلف الصالح: مالك، والأوزاعي، والثوري، والليث بن سعد، والشافعي، وأحمد، وإسحاق بن راهويه وغيرهم من أئمة المسلمين قديماً وحديثاً، وهو امرارها كما جاءت من غير تكييف ولا تشبيه، ولا تعطيل، والظاهر المتبادر إلى أذهان المشبهين منفي عن الله لا يشبهه شيء من خلقه {ليس كمثله شيء وهو السميع البصير} (الشورى: ۱۱) بل الأمر كما قال الأئمة منهم نعيم بن حماد الخزاعي، شيخ البخاري، قال: من شبه الله بخلقه كفر، ومن جحد ما وصف الله به نفسه فقد كفر، وليس فيما وصف الله به نفسه ولا رسوله تشبيه فمن أثبت الله تعالى ما وردت به الآيات الصريحة والأخبار الصحيحة على الوجه الذي يليق بجلال الله تعالى ونفى عن الله تعالى النقائص فقد سلك سبيل الهدى۔ (۲)

اس مقام پر لوگوں نے بہت کچھ قیاس آرائیاں کی ہیں، اور عقل کے گھوڑے دوڑائے ہیں، جن کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں۔ ہم اس بارے میں صرف سلفِ

(۱) بیان الفوائد: ۱۹۷-۱۹۸/۱

(۲) تفسیر ابن کثیر: ۲۲۳ مکمل، وانظر التفسیر المنیر: ۵۹۹/۳

صالحین کا مسلک اختیار کرتے ہیں، یعنی امام مالکؒ، اوزاعیؒ، ثوریؒ، لیث بن سعدؒ، شافعیؒ، احمدؒ اور اسحاق بن راہویہؒ وغیرہ اور پرانے یا نئے ائمۃ المسلمین کا ۔۔۔ اور وہ مسلک یہ ہے کہ اس پر یقین کر لیا جائے، بغیر کسی کیفیت و تشبیہ کے اور بغیر اس فوری خیال کی طرف متوجہ ہونے کے، جس سے تشبیہ کا عقیدہ ذہن میں آتا ہے اور جو صفاتِ باری تعالیٰ سے بعید ہے۔ غرض جو کچھ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے، بغیر اس پر خیال آرائی اور شبہ کے، اسے تسلیم کر لیا جائے اور بلا چوں و چرا اسے مان لیا جائے۔ اس لیے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کسی شے کے مشابہ اور مماثل نہیں ہے اور وہ سمیع و بصیر ہے۔

جیسا کہ مجتہدین نے ارشاد فرمایا ہے، جن میں نعیم بن حماد الخزاعی بھی ہیں، جو کہ امام بخاریؒ کے استاذ ہیں۔

ان کا ارشاد ہے: جس نے اللہ تعالیٰ کو کسی مخلوق سے تشبیہ دی، وہ کفر کا مرتکب ہو گیا۔ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے جن باتوں سے اللہ تعالیٰ کی توصیف بیان نہیں کی، ویسی توصیف بیان کرنا ۔۔۔ یہی تشبیہ ہے، اور جس نے اللہ تعالیٰ کے لیے ایسے اوصاف ثابت کیے، جن کی صراحت آیاتِ قرآنیہ اور احادیثِ صحیحہ میں وارد ہوئی ہے، جو کہ باری تعالیٰ کے جلال کو ثابت کرتی ہے اور تمام نقائص سے باری تعالیٰ کی ذات کو بری کرتی ہے، تو ایسا شخص ہی صحیح خیال (یعنی صراطِ مستقیم) پر ہے۔

علامہ آلوسیؒ فرماتے ہیں:

عن مالک رحمہ اللہ تعالیٰ أنہ سئل کیف استوی؟ فاطرق رأسہ ملیاً حتی علتہ الرحضاء ثم رفع رأسہ.

حضرت امام مالکؒ سے کسی نے استواء کی کیفیت دریافت کی تو انھیں پسینہ آ گیا اور کچھ دیر سر جھکانے کے بعد انھوں نے ارشاد فرمایا:

الاستواء غیر مجھول، والکیف غیر معقول، والإیمان بہ واجب، والسؤال عنہ بدعۃ.

استواء کا مطلب تو معلوم ہے، لیکن اس کی کیفیت عقل میں آنے والی نہیں، اور اس پر ایمان لانا واجب ہے، اور اس کے بارے میں سوال کرنا بدعت ہے۔

پھر سائل سے فرمایا:

وما أظنك إلا ضالاً، ثم أمر به فأخرج الخ۔ (۱)

میرے خیال میں تو بدعتی ہے، پھر اسے اپنی مجلس سے نکلوا دیا۔

اس بارے میں سوال کرنے کو بدعت اس لیے فرمایا کہ حضراتِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سامنے بھی (یہ) آیاتِ متشابہات تھیں، لیکن انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کے بارے میں کیفیت اور حقیقت سمجھنے کے لیے کوئی سوال نہیں کیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ان امور کو واضح نہیں فرمایا۔ جس طرح وہ حضرات (صحابہؓ) آیاتِ متشابہات پر اجمالاً ایمان لے آئے، اسی طرح بعد والوں کے لیے بھی اسی میں خیر ہے کہ بغیر سمجھے ہوئے ایمان لے آئیں۔ (۲)

علامہ بغویؒ نے لکھا ہے:

معتزلہ کے نزدیک 'استویٰ' سے مراد 'غلبہ پانا' 'تسلط جمانا' ہے۔ اہل سنت والجماعت کہتے ہیں کہ عرش پر استواء اللہ تعالیٰ کی ایک صفت ہے، جو بے کیف ہے (یعنی اس کی کیفیت، حالت، ہیئت، وضع سمجھی نہیں جا سکتی)، اس پر ایمان لانا واجب ہے اور اس کا علم اللہ پر چھوڑ دینا چاہیے۔ (۳)

تفسیرِ نسفی میں ہے:

امام جعفر، حسن بصری، ابو حنیفہ و مالک رحمہم اللہ تعالیٰ سے منقول ہے:

ان الاستواء معلوم، والكيف فيه مجهول، والإيمان به واجب، والجحود به كفر، والسؤال عنه بدعة. (۴)

---

(۱) روح المعانی: ۸/۲۰۰ (۲) انوار البیان: ۲/۳۳۲

(۳) مظہری: ۳/۲۱۶ (۴) مدارک التنزیل: ۱/۹۴۹

ان ائمہ سے مروی ہے کہ استواء معلوم ہے، کیفیت مجہول اور اس پر ایمان لانا واجب اور اس کا انکار کرنا کفر اور اس کے متعلق سوال کرنا بدعت ہے۔

لغت میں عرش تختِ حکومت کو کہتے ہیں اور عرشِ خداوندی ایک عظیم ترین مخلوق ہے، جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک بڑی باعزت ہے۔ تجلیاتِ الٰہیہ سے اس کا خصوصی تعلق ہے، اسی لیے اسے عرش الرحمٰن کہا جاتا ہے۔ یہ اضافت (مکانی نہیں بلکہ) صرف اعزازی ہے، جیسے کعبۃ اللہ بطورِ احترام کہا جاتا ہے۔(۱)

حضرت تھانوی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

سلف کا مذہب ایسے نصوص میں تفویض مراد کی حق سبحانہ وتعالیٰ کی طرف ہے، یعنی جو استواء حق تعالیٰ نے مراد لیا ہے، اور وہ حق تعالیٰ کی شان کے موافق ہے--- وہی مراد ہے۔(۲)

معلوم ہوا، استواء علی العرش کے متعلق صحیح و بے غبار وہی بات ہے، جو جمہور سلفِ صالحین سے منقول ہے کہ اس کی حقیقت وکیفیت کسی کو معلوم نہیں--- متشابہات میں سے ہے۔ عقیدہ اتنا رکھنا ہے کہ استواء علی العرش حق ہے، اس کی کیفیت اللہ جل شانہ کی شان کے مطابق ومناسب ہوگی، جس کا ادراک دنیا میں کسی کو نہیں ہوسکتا۔(۳)

درِ منثور میں ہے:

أخرج ابن مردویة واللالكائي في السنة عن أم سلمة أم المؤمنين رضی اللہ عنها في قوله {ثم استوى على العرش} قالت: الكيف غير معقول، والاستواء غير مجهول، والاقرار به ايمان، والجحود به كفر۔ وأخرج اللالكائي عن ابن

(۱)مظہری: ۳/۲۱۲، وکذا فی الجلالین: ۱۳۲ (۲)بیان القرآن: ۱/۱۹

(۳)معارف القرآن: ۶/۲۵

عيينة قال: سئل ربيعة عن قوله {ثم استوىٰ على العرش} كيف استوى؟ قال: الاستواء غير مجهول، والكيف غير معقول، ومن الله الرسالة، وعلى الرسول البلاغ، وعلينا التصديق۔ وأخرجه البيهقي في الأسماء والصفات من طريق عبدالله بن صالح بن مسلم قال: سئل ربيعة... فذكره.

امام مردویہ اور لالکائی رحمہما اللہ نے 'السنۃ' میں ذکر کیا ہے: ام المؤمنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے {ثم استوىٰ على العرش} کی تفسیر میں فرمایا: اس کی کیفیت عقل سے باہر ہے، استواء غیر مجہول ہے۔ اس کا اقرار کرنا ایمان ہے اور اس کا انکار کرنا کفر ہے۔

وأخرج البيهقي عن أحمد بن أبي الحواري قال: سمعت سفيان بن عيينة يقول: كلما وصف الله من نفسه في كتابه فتفسيره تلاوته والسكوت عليه۔ وأخرج البيهقي عن إسحاق بن موسى قال: سمعت ابن عيينة يقول: ما وصف الله به نفسه فتفسيره قراءته، ليس لأحد أن يفسره إلا الله تعالى ورسله صلوات الله عليهم. (۱)

بیہقیؒ نے احمد بن ابی الحواری سے یہ قول بیان کیا ہے کہ میں نے سفیان بن عیینہ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ جہاں بھی اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں اپنی ذات سے متعلق کوئی وصف بیان کیا ہے، اس کی تفسیر اس کی قراءت ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی کے لیے اس کی تفسیر بیان کرنا درست نہیں۔

تفسیر قرطبی میں ہے:

{قوله تعالى: ثم استوىٰ على العرش} هذه مسألة الاستواء، وللعلماء فيها كلام وإجراء۔ وقد بينا أقوال العلماء فيها في (الكتاب الأسنى في شرح أسماء الله الحسنى وصفاته العلى) وذكرنا فيها هناك أربعة عشر قولاً۔ والأكثر من

(۱) الدر المنثور في التفسير المأثور: ۳/۱۷۰، دار الكتب العلمية، بيروت

المتقدمين والمتأخرين أنه إذا وجب تنزيه الباری سبحانه عن الجهة والتحيز فمن ضرورة ذلک ولواحقه اللازمة عليه عنه عامة العلماء المتقدمين وقادتهم متی اختص بجهة أن يکون في مكان أو حيز، ويلزم على المكان والحيز الحرکة والکون للمتحيز، والتغير والحدوث.

{ثم استویٰ علی العرش}-یہ استویٰ کا مسئلہ ہے، اس کے ذیل میں علماء کرام کا بہت سا کلام اور جرأت کا اظہار ہے۔ہم نے اس بارے میں علماء کے اقوال 'الکتاب الأسنی فی شرح اسماء الحسنی و صفاته العلی' میں بیان کر دیے ہیں اور وہاں ہم نے چودہ اقوال ذکر کیے ہیں۔

اکثر متقدمین اور متاخرین کا کہنا ہے کہ جب اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذات، جہت اور تحیز سے منزہ ہے اور پاک ہے، تو پھر اس کے لواحق ولوازم میں سے یہ بھی ہے کہ عام علماء متقدمین کے نزدیک اور متاخرین میں سے محققین اور قائدین کے نزدیک اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات جہت سے پاک اور منزہ ہے، کیوں کہ ان کے نزدیک اس سے اوپر کوئی جہت نہیں۔ان کے نزدیک اس سے یہ لازم آتا ہے کہ جب اسے جہت کے ساتھ خاص کر دیا جائے تو پھر وہ کسی مکان اور حیز میں ہو اور مکان اور حیز تسلیم کرنے پر متحیز کے لیے حرکت، سکون، تغیر اور حدوث ماننا لازم آتا ہے (اور جیسا کہ ہم تفصیل سے عرض کر چکے ہیں، اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذات ان تمام چیزوں سے منزہ ہے)۔

هذا قول المتكلمين وقد كان السلف الأول رضی اللہ عنهم لا يقولون بنفي الجهة ولا ينطقون بذلک، بل نطقوهم والكافة باثباتها الله تالیٰ کما نطق کتابه وأخبرت رسله. ولم ينكر أحد من السلف الصالح أنه استوىٰ على عرشه حقيقة. وخص العرش بذلک لأنه أعظم مخلوقاته، وانما جهلوا كيفية الاستواء فإنه لا تعلم حقيقة.

یہ متکلمین کا قول ہے اور دورِ اوّل کے اسلاف جہت کی نفی کے بارے میں کوئی

کلام نہیں کرتے تھے اور نہ اس کے بارے میں وہ بولتے تھے، بلکہ انھوں نے یہی بات کہی ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے لیے اسے کے اثبات میں وہی کافی ہے، جو اس نے اپنی کتاب میں بیان فرمادیا ہے اور اس کے رسولوں نے خبر دی ہے اور سلف صالح میں سے کسی نے بھی اس کا انکار نہیں کیا ہے کہ وہ اپنے عرش پر حقیقۃً متمکن ہوا ہے اور اس نے عرش کو اپنے لیے خاص کیا ہے، کیوں کہ وہ اس کی مخلوقات میں سے بہت عظیم ہے، لیکن وہ (متکلمین اور تمام بندے) اس استواء اور تمکن کی کیفیت سے ناواقف ہیں، کیوں کہ اس کی حقیقت معلوم نہیں۔

امام مالکؒ نے ارشاد فرمایا:

الاستواء معلوم--یعنی في اللغة۔ والکیف مجهول، والسؤال عن هذا بدعة۔ وکذا قالت أم سلمة رضی اللہ عنها--وهذا القدر کاف، ومن أراد زیادة علیه فلیقف علیه في موضعه من کتب العلماء.

لغت کے اعتبار سے استواء کے معنی معلوم ہیں، لیکن اس کی کیفیت مجہول ہے، لہٰذا اس کے متعلق سوال کرنا بدعت ہے۔ اسی طرح حضرت ام سلمہؓ نے کہا اور یہ دونوں باتیں ہم علاحدہ بھی عرض کر چکے ہیں۔ (عوام کے لیے) بس اتنا جان لینا کافی ہے اور جو اس سے زیادہ جاننا چاہے، وہ علماء کی کتابوں سے اس مقام کا مطالعہ کرے۔

والاستواء في کلام العرب هو العلو والاستقرار.

عربی میں استواء کے معنی بلندی اور استقرار کے ہیں۔

جوہری نے کہا:

واستوی من أعوجاج.

وہ سیدھا ہو گیا اور ٹیڑھا ہونے سے بچ گیا۔

واستوی علی ظهر دابته، أي استقر.

وہ اپنی سواری پر جم کر بیٹھ گیا۔

واستوى إلى السماء أى قصد.

اس نے آسمان کا قصد کیا۔

واستوى أى استولى وظهر.

اور استواء بمعنی والی بننا اور غالب آنا۔

جیسے کسی شاعر نے کہا ہے:

قد استوى بشر على العراق من غير سيف ودم مهراق

بشر نے عراق پر قبضہ حاصل کر لیا، بغیر تلوار چلائے اور خون بہائے۔

واستوى الرجل أى انتهى شبابه.

استواء رجل کے معنی ہیں کہ آدمی کی جوانی، انتہا کو پہنچ گئی۔

واستوى إذا اعتدل.

اس کے معنی ہیں، کہ شئے معتدل اور سیدھی ہوگئی۔

وحكى أبو عمر عبد البر عن أبى عبيدة فى قوله تعالى: {الرحمن على العرش استوى} (۱)

قال علا۔

ابوعمر بن عبد البر نے ابوعبیدہ سے باری تعالیٰ کے قول {الرحمن على العرش استوى} ۔(۲) کے بارے میں نقل کیا ہے کہ اس کا مطلب ہے کہ وہ عرش پر بلند ہوا۔

شاعر نے کہا:

وقال الشاعر:

فأوردتهم ماء بفيفاء قفرة وقد حلق النجم اليمانى فاستوى

أى علا وارتفع.

اس میں استواء بلند ہونے کے معنی میں ہے۔

---

(۱) (۲) طٰہٰ:۵

امام قرطبیؒ آگے فرماتے ہیں: میں کہتا ہوں:

فعلوا الله وارتفاعه عبارة عن علو مجده وصفاته وملكوته. أي ليس فوقه فيما يجب من معالي الجلال أحد، ولا معه من يكون العلو مشتركا بينه وبينه؛ لكنه العلي بالإطلاق سبحانه.

اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی بلندی وارتفاع، اس کی عظمت وبزرگی، اس کی صفات اور بادشاہی کی بلندی اور رفعت سے عبارت ہے، یعنی بتانا یہ مقصود ہے کہ اس سے اوپر کوئی نہیں ہے، جس کے لیے عظمت وجلال کے ان معانی میں سے کوئی ایک بھی ثابت ہو اور نہ کوئی اور اس کے ساتھ ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے مابین یہ بلندی مشترک ہو، بلکہ یہ عظمت ورفعت اور بلندی بلا اطلاق اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذات کے لیے ہے۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

{على العرش}

عرش پر۔

لفظ مشترك يطلق على أكثر من واحد.

یہ لفظ مشترک ہے، جس کا استعمال ایک سے زیادہ معانی پر ہوتا ہے۔

علامہ جوہریؒ وغیرہ نے کہا:

العرش سرير الملك.

عرش کا معنی بادشاہ کا تخت ہے۔

اور قرآن کریم میں ہے:

{ نَكِّرُوا لَهَا عَرْشَهَا } (۱)

شکل بدل دو اس کے لیے اس کے تخت کی۔

{ وَرَفَعَ اَبَوَيْهِ عَلَى الْعَرْشِ } (۲)

(۱) النمل: ۴۱ (۲) یوسف: ۱۰۰

جب شاہی دربار میں پہنچے تو آپ نے اپنے والد کو اوپر تخت پر بٹھایا۔

والعرش: سقف البیت.

عرش کا ایک معنی مکان کی چھت ہے۔

وعرش القدم: مانتأفی ظهورها وفیه الأصابع.

عرش القدم کا معنی ہیں: قدم کی پشت کا بلند حصہ اور اس میں انگلیاں بھی داخل ہیں۔

وعرش السماک: اربعة کواکب صفار أسفل العواء.

عرش السماک یعنی چار چھوٹے ستارے، جو عواء (چاند کی منازل میں سے ایک ہے) کے نیچے ہیں۔

یقال: إنها عجز الأسد.

کہا جاتا ہے، بے شک وہ شیر کی دُم ہے۔

وعرش البئر: طیها بالخشب، وبعد أن یطوی أسفلها بالحجارة قدر قامة، فذلک الخشب هو العرش، والجمع عروش.

عرش البئر کے معنی ہیں: کنویں کو لکڑی کے ساتھ بنانا، اس طرح کہ اسے نیچے آدم کے قد کی مقدار پتھر سے بنالیا جائے، تو وہ لکڑی جس سے اوپر کا حصہ بنایا جاتا ہے، وہ عرش کہلاتی ہے۔ اس کی جمع 'عروش' ہے۔

والعرش اسم لمکة والعرش الملک والسلطان.

'عرش' مکہ مکرمہ کا ایک نام بھی ہے اور اس کے معنی ملک اور سلطنت بھی ہیں۔

کہا جاتا ہے:

ثل عرش فلان إذا ذهب ملکه وسلطانه وعزه.

جب اس کا ملک، سلطنت اور عزت جاتی رہی۔

وقد يؤول العرش في الآية بمعنى الملك أي ما استوى الملك إلا له جل وعز. وهو قول حسن وفيه نظر.

اور کبھی آیت میں عرش کی تاویل ملک سے کی جاتی ہے، یعنی کوئی بادشاہی اور ملک مستحکم و مضبوط نہیں، مگر بس وہی، جو اللہ عز و جل کا ہے۔ یہ ایک اچھا قول ہے، لیکن اس میں بھی نظر ہے۔

وقد بيناه في جملة الأقوال في كتابنا۔ والحمد لله.

اس سے متعلق تمام اقوال الحمد للہ ہم نے اپنی کتاب میں جمع کر دیے ہیں۔(۱)

حق تعالیٰ کی شان کے موافق ---- کے معنی

شیخ صالح بن عثیمینؒ فرماتے ہیں:

وأما قولنا "يليق بجلاله وعظمته" فالمراد به أن استوائه على عرشه كسائر صفاته يليق بجلاله و عظمته، ولا يماثل استواء المخلوقين، فهو عائد الى الكيفية التي عليها هذا الاستواء، لأن الصفات تابعة للموصوف، فكما أن الله تعالى ---ذاتاً--- لا تماثل الذوات فانه صفاته لا تماثل الصفات {ليس كمثله شيء وهو السميع البصير} ليس كمثله شيء في ذاته ولا صفاته. (۲)

یہ کہنا کہ "جس طرح اس کے جلال وعظمت کے شایانِ شان ہے" --- اس سے مراد یہ ہے کہ جس طرح اس کی دیگر تمام صفات اس کی پاک ذات کے جلال وعظمت کے شایانِ شان ہیں، عرش پر اس کا استواء بھی اسی طرح ہے، جس طرح اس کی پاک ذات کے لائق ہے۔ وہ مخلوقات کے استواء کی طرح نہیں ہے، کیونکہ صفات اپنے موصوف کے تابع ہوتی ہیں، جس طرح اللہ تعالیٰ کی ذات دیگر ذوات کی طرح

(۱) الجامع لأحكام القرآن: ۱۸۶-۱۸۷/۷، دار إحياء التراث العربي، بيروت

(۲) فتاوی أركان اسلام: ۸۶، دار الثريا (۳) سورة الشورى: ۱۱

نہیں ہے، اسی طرح اس کی صفات کسی مخلوق کی صفات کی طرح نہیں ہیں۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

{ لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ }۔(۳)

اس جیسی کوئی شی نہیں۔

وكذا قال علي الطنطاوي: آيات وردت على سبيل الإخبار من الله، كقوله {الرحمن على العرش استوى}، فنحن لا نقول: إنه ما استوى، فنكون قد نفينا ما أثبته الله. ولا نقول: إنه استوى على العرش كما يستوي القاعد على الكرسي، فنكون قد شبهنا الخالق بالمخلوق، ولكن نؤمن بأن هذا هو كلام الله، وأن الله مراداً منه لم نفهم حقيقته وتفصيله، لأنه لم يبين لنا مفصلاً، ولأن العقل البشري--- كما قدمنا يعجز عن الوصول إلى ذلك بنفسه.(۱)

وقال: بين الله في القرآن، أن فيه آيات محكمات، واضحة المعنى، صريحة اللفظ، وآيات وردت متشابهات، وهي التي لا يضح المعنى المراد منها تماماً، بل تكثر افهام الناس لها، وتشابه تفسيراتها حتى يتعسر معرفة المراد منها، وآيات الصفات منها، وأن على المؤمن أن لا يطل العوص في معناها، ولا يتتبعها فيجمعها، ليفتن الناس بالبحث فيها.

وقال: المسلمون الأولون، وهم سلف هذه الأمة، وخيرها وأفضلها، لم يتكلموا فيها، ولم يقولوا إنها حقيقة، ولم يقولوا إنها مجاز، ولم يخوضوا في شرحها، بل آمنوا كما جاءت من عند الله على مراد الله.(۲)

حدیث میں مسئلہ کا ذکر

اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآن کریم میں ارشاد فرمایا ہے:

---

(۱)تعریف عام بدین الاسلام:۹۳ (۲)تعریف عام:۹۶-۹۷

(۳)سورۃ البقرۃ:۲۶

{ يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا ۙ وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ۭ } (۳)
قرآن کریم بعض لوگوں کے لیے ہدایت کا سبب بنتا ہے اور بعض کے لیے ضلالت و گمراہی کا۔

جب کہ بنفسہ یہ خود کلام پاک اور کلامِ الٰہی ہے، لیکن یہ انسان کا اپنا ظرف ہے کہ وہ اس کے ذریعہ ہدایت حاصل کرتا ہے یا ضلالت کی گھاٹیوں میں جا پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے لوگ قرآن پاک کی آیاتِ متشابہات میں جمہور کے خلاف جا کر غور و خوض کرتے ہیں اور نتیجۃً گمراہ ہو جاتے ہیں۔ اللّٰھم احفظنا منہ

استواء علی العرش سے متعلق آیات و روایات کا بھی یہی حال ہے کہ باوجود سکوتِ سلف کے بعض خلف نے اس میں ایسی چہ می گوئیاں کیں کہ دائرۂ عافیت سے باہر نکل گئے۔ آیات کے متعلق تفصیل تو آپ پڑھ ہی آئے ہیں، لیکن بعض روایات سے بھی لوگوں کو اس مسئلہ میں شبہ ہوا ہے، اس کا حال مختصراً بیان کیا جاتا ہے، ملاحظہ فرمائیں۔

حضرت معاویہؓ کی باندی کا واقعہ

حضرت معاویہ بن الحکمؓ کی باندی سے حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے امتحاناً پوچھا:

أين الله؟

اللہ کہاں ہے؟

اس نے عرض کیا:

في السماء.

آسمان میں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

من أنا؟

میں کون ہوں؟

اس نے عرض کیا:

أنت رسول اللہ.

آپ اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہیں۔

تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

اعتقھا، فإنھا مؤمنۃ۔ (۱)

اسے آزاد کر دو، یہ مومنہ ہے۔

اس حدیث سے ظاہر متبادر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ آسمانوں میں ہے، لیکن حق یہ ہے کہ اس حدیث یا ان جیسے نصوص سے ان کا ظاہر مراد نہیں، بلکہ ان سے مراد علوِ شان ہے۔

قال العثماني رحمہ اللہ: (قولہ: في السماء الخ)، قال الکرماني رحمہ اللہ: ظاھرہ غیر مراد، اذ اللہ منزہ عن الحلول في المکان، لکن لما کانت جھۃ العلو أشرف من غیرھا أضافھا. إلیہ أشارۃ إلی علو الذات والصفات الخ۔ (۲) وقال الشیخ السھارنفوری رحمہ اللہ: (قالت: في السماء) والمراد بھا نفي الألوھیۃ عن الأصنام، واعتقاد وجودہ وعظمتہ وعلوہ لا الجھۃ۔ (۳)

اصل مسئلہ اور اس کی وضاحت، سلیس زبان میں

اب مسئلہ کی تفصیل آسان زبان میں ملاحظہ فرمایئے:

علماء اہل سنت والجماعت یہ کہتے ہیں کہ براہینِ قطعیہ اور دلائل عقلیہ ونقلیہ سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ مخلوق کی مشابہت اور مماثلت سے اور کمیت وکیفیت اور مکان وجہت سے پاک اور منزہ ہے۔ لہٰذا جن آیات اور احادیث میں حق جل شانہ کی

(۱) مسلم: ۵۳۷، ابو داؤد: ۹۳۰، نسائی: ۱۲۱۸ (۲) فتح الملہم: ۲/۲۲

(۳) بذل المجہود: ۲/۲۳۰

ہستی کو آسمان یا عرش کی طرف منسوب کیا ہے، ان کا یہ مطلب نہیں کہ آسمان اور عرش اللہ کا مکان اور مستقر ہے، بلکہ ان سے اللہ جل شانہ کی شانِ رفعت، علو، عظمت اور کبریائی کو بیان کرنا مقصود ہے۔ اس لیے کہ مخلوقات میں سب سے بلند عرشِ عظیم ہے، ورنہ عرش سے لے کر فرش تک سارا عالم اس کے سامنے ایک ذرۂ بے مقدار ہے، وہ اس ذرہ میں کیسے سما سکتا ہے۔ سب اسی کی مخلوق ہے اور مخلوق اور حادث کی کیا مجال کہ وہ خالقِ قدیم کا مکان اور جائے قرار بن سکے۔

خدا تعالیٰ اس سے منزہ ہے کہ وہ عرش یا کسی جسم پر متمکن اور مستقر ہو، جس طرح بادشاہ کو یہ کہا جا سکتا ہے کہ بادشاہ تخت پر بیٹھا ہوا ہے، خدا تعالیٰ کی نسبت ایسا کہنا جائز نہیں، اس لیے کہ خدا تعالیٰ کوئی مقداری نہیں، کیونکہ جسم پر وہی چیز متمکن ہو سکتی ہے کہ جو ذی مقدار ہو اور اس سے بڑی ہو یا چھوٹی ہو یا اس کے برابر ہو، اور یہ کمی بیشی بارگاہِ خداوندی میں محال ہے۔ عقلاً یہ ممکن نہیں کہ کوئی جسمِ مخلوق، جیسے: عرش، کہ وہ اپنے خالق کو اپنے اوپر اٹھا سکے اور پھر فرشتے اس جسم (عرش) کو اپنے کاندھوں پر اٹھائیں۔

کما قال تعالی: { وَيَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ ثَمٰنِيَةٌ ﴿۱۷﴾ }

عقلاً یہ بات محال ہے کہ کوئی مخلوق، فرشتہ ہو یا جسم، وہ اپنے خالق کو اپنے کاندھوں پر اٹھا سکے اور جن آیات میں اللہ تعالیٰ کی شانِ علو اور فوقیت کا ذکر آیا ہے، ان سے علوِ مرتبہ اور فوقیتِ قہر و غلبہ مراد ہے، حسی اور مکانی فوقیت اور علو مراد نہیں۔

کما قال تعالی: { وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ. وَهُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ. وَلَهُ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى }

اور جیسے:

{ وَفَوْقَ كُلِّ ذِىْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ اور اَنَا فَوْقَهُمْ قَاهِرُوْنَ }

اس میں فوقیتِ مرتبہ اور فوقیتِ قہر اور غلبہ مراد ہے۔ اور جن آیات اور احادیث

میں اللہ تعالیٰ کے قرب وبُعد کا ذکر آیا ہے، اس سے مسافت کے اعتبار سے قرب وبعد مراد نہیں، بلکہ معنوی قرب وبعد مراد ہے اور نزولِ خداوندی سے نزولِ رحمت یا خدا تعالیٰ کا بندوں کی طرف متوجہ ہونا مراد ہے۔ معاذ اللہ! خدا کا بلندی سے پستی کی طرف اترنا مراد نہیں۔ اور دعا کے وقت آسمان کی طرف ہاتھ اٹھانا اس لیے نہیں کہ آسمان اللہ تعالیٰ کا مکان ہے، بلکہ اس لیے ہے کہ آسمان قبلۂ دعا ہے جیسا کہ خانۂ کعبہ قبلۂ نماز ہے۔ خانۂ کعبہ کو جو بیت اللہ کہا جاتا ہے، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ کی عبادت کا گھر ہے اور معاذ اللہ یہ مطلب نہیں کہ خانۂ کعبہ اللہ تعالیٰ کا مکان ہے اور اس کے رہنے کی جگہ ہے۔ سمتِ قبلہ عابدین کی عبادت کے لیے مقرر کی گئی۔ معاذ اللہ معبود کی سمت نہیں۔ پس جیسے کعبہ نماز کا قبلہ ہے، ویسے ہی آسمان دعا کا قبلہ ہے اور دونوں صورتوں میں اللہ تعالیٰ اس سے منزہ ہے کہ وہ خانۂ کعبہ کے اندر یا آسمان کے اندر متمکن ہو۔

خلاصۂ کلام یہ کہ ان اوصاف کو اوصافِ تسبیحی اور اوصافِ تنزیہی اور اوصافِ جلال بھی کہتے ہیں اور علم وقدرت اور سمع وبصر جیسے اوصاف کو اوصافِ تحمیدی اور اوصافِ جمال کہتے ہیں۔

مجسمہ اور مشتبہ یہ کہتے ہیں کہ عرش ایک قسم کا تخت ہے اور اللہ تعالیٰ اس پر مستوی ہے، یعنی اس پر مستقر اور متمکن ہے اور فرشتے اس عرش کو اٹھائے ہوئے ہیں اور {اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى} کے ظاہر الفاظ سے استدلال کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ {استواء علی العرش} سے عرش پر بیٹھنا مراد ہے۔

بعض یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر مکان میں ہے اور ہر جگہ موجود ہے اور اللہ تعالیٰ کے اس قول سے حجت پکڑتے ہیں {مَا يَكُوْنُ مِنْ نَّجْوٰى ثَلٰثَةٍ اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ، الآیۃ} اور حق تعالیٰ کے اس قول سے {وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ۝} اور

{ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُبْصِرُوْنَ } اور { وَهُوَ الَّذِیْ فِی السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّفِی الْاَرْضِ اِلٰهٌ } سے دلیل لاتے ہیں۔

اہل سنت والجماعت کہتے ہیں کہ قرآن کریم میں اس قسم کی جس قدر آیتیں وارد ہوئی ہیں، ان سے حق تعالیٰ شانہ کے کمالِ علو اور رفعتِ شان کو اور اس کے احاطۂ علم وقدرت کو بیان کرنا مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ کا علم اور قدرت تمام کائنات کو محیط ہے جیسا کہ ایک حدیث قدسی میں آیا ہے:

قلب المؤمن بين اصبعين من أصابع الرحمن.

مومن کا دل خدا کی دو انگلیوں کے درمیان ہے۔

سو اس سے بالاجماع متعارف اور ظاہری اور حسی معنی مراد نہیں، بلکہ اس سے قدرة علی التقلیب بیان کرنا ہے کہ قلب خدا کے اختیار میں ہے جدھر چاہے پھیر دے۔

ایک حدیث میں حجرِ اسود کے متعلق یہ آیا ہے:

إنه يمين الله في الأرض.

حجر اسود زمین میں اللہ کا دایاں ہاتھ ہے۔

یہاں بھی بالاتفاق ظاہری معنی مراد نہیں، بلکہ معنی مجازی مراد ہیں کہ حجر اسود کو بوسہ دینا گویا کہ اللہ سے مصافحہ کرنا اور اس کے دستِ قدرت کو بوسہ دینا ہے۔

جیسا کہ قرآن کریم میں آیا ہے:

{ اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَكَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰهَ }

جو لوگ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک پر بیعت کرتے ہیں، گویا کہ وہ اللہ تعالیٰ سے بیعت کرتے ہیں۔ یہاں بھی بالاتفاق مجازی معنی مراد ہیں، معاذ اللہ! یہ مطلب نہیں کہ خدا اور رسول دونوں ایک دوسرے کا عین ہیں۔

اسی طرح سمجھو کہ استواء علی العرش سے ظاہری اور حسی معنی مراد نہیں کہ اللہ تعالیٰ عرش پر بیٹھا ہوا ہے، بلکہ اس سے اللہ تعالیٰ کی علوِ شان اور رفعتِ مرتبہ کا بتلانا (مقصود) ہے۔

کماقال تعالیٰ: { رَفِيعُ الدَّرَجٰتِ ذُو الْعَرْشِ }

اسی طرح جس حدیث میں یہ آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر شب آسمانِ دنیا پر نزول فرماتا ہے، سو معاذ اللہ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ خدا کوئی جسم ہے کہ عرش سے اتر کر آسمانِ دنیا پر آتا ہے، بلکہ اس خاص وقت میں اس کی رحمت کا نزول یا کسی رحمت کے فرشتے کا آسمانِ دنیا پر اترنا مراد ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا بندہ سے قرب اور بعد باعتبار مسافت کے مراد نہیں، بلکہ قرب سے عزت وکرامت اور بُعد سے ذلت واہانت مراد ہے۔ مطیع اور فرمانبردار بندہ اللہ سے بلا کیفیت اور بلا کسی مسافت کے قریب ہے اور نافرمان بندہ بلا کیفیت اور بلا مسافت کے اللہ سے بعید ہے۔

اہل سنت والجماعت کا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مکان اور جہت اور سمت سے پاک اور منزہ ہے۔ اس لیے کہ جو چیز کسی مکان میں ہوتی ہے، تو وہ محدود ہوتی ہے اور مقداری ہوتی ہے اور مکین مقدار میں اور مسافت میں اور مساحت میں مکان سے کم ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ مقدار سے، مساحت سے، مسافت سے، کمی اور زیادتی سے منزہ ہے، اور جو چیز سمت اور جہت میں ہوتی ہے تو وہ اس سمت اور جہت میں محصور اور محدود ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ اس سے بھی منزہ ہے۔ مکان، زمان، جہت اور سمت سب اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں۔ ازل میں صرف اللہ تعالیٰ تھا اور اس کے سوا کوئی شی نہ تھی، نہ مکان اور نہ زمان، نہ عرش وکرسی اور نہ زمین وآسمان۔ اس نے اپنی قدرت سے عرش وکرسی اور زمین وآسمان کو پیدا کیا۔ وہ خداوند قدوس ان چیزوں کے پیدا کرنے کے بعد اسی شان سے ہے کہ جس شان سے وہ مکان اور زمان اور زمین وآسمان کے پیدا کرنے

سے پہلے تھا۔

ہم اہل سنت والجماعت اس بات پر ایمان لاتے ہیں کہ بلا کسی تشبیہ اور تمثیل کے، بلا کسی کمیت اور کیفیت کے اور بلا کسی مسافت اور مساحت کے رحمن کا استواء عرش پر حق ہے، جس معنی کا اللہ تعالیٰ نے ارادہ فرمایا ہے اور جو اس کی شان کے لائق ہے، جس کا علم اللہ تعالیٰ ہی کو ہے، معاذ اللہ یہ مطلب ہرگز نہیں کہ جیسے بادشاہ تخت پر بیٹھتا ہے، ایسا ہی اللہ تعالیٰ بھی عرش پر بیٹھا ہوا ہے اور عرش پر مستقر اور متمکن ہے۔ اس لیے کہ تمکن اور استقرار شان حادث اور ممکن کی ہے۔ مکان، مکین کو محیط ہوتا ہے اور عرش تو ایک جسم عظیم نورانی ہے، جو اللہ کی مخلوق ہے، اس کی کیا مجال کہ وہ خداوند ذوالجلال کو اٹھا سکے۔ معاذ اللہ! عرش خدا تعالیٰ کو اٹھائے ہوئے نہیں بلکہ اللہ کا لطف وقدرت عرش کو اٹھائے ہوئے اور تھامے ہوئے ہے۔

استواء علی العرش کے ذکر سے مقصود خداوند ذوالجلال کی علوِ شان اور بے مثال رفعت کو بیان کرنا ہے، اور ﴿وَهُوَ الَّذِيْ فِي السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّ فِي الْاَرْضِ اِلٰهٌ﴾ سے یہ جتلانا مقصود ہے کہ آسمان وزمین میں سب جگہ اسی کی عبادت کی جاتی ہے، وہی آسمان وزمین میں متصرف ہے اور سب جگہ اسی کا حکم چلتا ہے۔ آسمان وزمین اس کی عبادت اور تصرف کا اور اس کی حکمرانی کا ظرف ہے، معبود ظرف نہیں، اور معاذ اللہ! یہ مطلب نہیں کہ عرش یا آسمان اللہ تعالیٰ کا مکان ہے، جس میں خدا تعالیٰ رہتا ہے۔

مجسمہ اور مشبہ نے ان آیات کا یہ مطلب سمجھا کہ عرش عظیم یا آسمان وزمین اللہ کا مکان اور جائے قرار ہے اور یہ نہ دیکھا کہ سارا قرآن تنزیہ اور تقدیس سے بھرا پڑا ہے کہ اللہ مخلوق کی مشابہت سے پاک ہے اور تمام انبیاء نے اپنی اپنی امتوں کو ایمانِ تنزیہی کی دعوت دی ہے، ایمان تشبیہی اور تمثیلی کی دعوت نہیں دی۔(۱)

---

(۱) عقائد الاسلام: ۳۸-۴۲/۲

الحاصل

{ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ }

پھر وہ اپنی قدرت اور قہر سے اور تدبیر اور تصرف سے 'عرشِ عظیم پر قایم ہوا' (اس طرح کہ) جو قیام اس کی شان کے لائق ہے۔

عرش پر قایم ہونے سے اس کی جلوہ افروزی مراد ہے، جس کی حقیقت سوائے خدا تعالیٰ کے کسی کو معلوم نہیں اور خدا تعالیٰ کا عرشِ عظیم پر قائم اور جلوہ فرما ہونا آسمانوں کے بلند کرنے سے کہیں زیادہ بلند اور برتر ہے۔ اس لیے لفظ ﴿ ثم ﴾ ان دونوں میں تفاضل اور تفاوت کے بیان کرنے کے لیے لایا گیا ہے کہ ﴿ استواء علی العرش ﴾ رفعِ سمٰوٰت سے زیادہ اعلیٰ اور ارفع ہے، کیونکہ عرشِ عظیم تجلیاتِ خداوندی اور احکامِ الٰہیہ کا مصدر اور مرکز ہے۔ تمام عالم کی تدبیر اور تصرف کے احکام عرش عظیم ہی سے نازل ہوتے ہیں، عرش پر قائم ہونے کے یہ معنیٰ نہیں کہ وہ خداوند قدوس، بادشاہ کی طرح تخت پر برابر بیٹھا ہوا ہے، کیونکہ یہ صفت تو جسم کی ہے، جو وضع اور ہیئت کے ساتھ موصوف ہو اور اللہ تعالیٰ اس سے پاک اور منزہ ہے۔

فرقۂ مجسمہ اللہ تعالیٰ کو جسم گمان کرتا ہے اور { استویٰ } کے معنی بیٹھنے کے کرتا ہے۔ اہل سنت والجماعت یہ کہتے ہیں کہ { ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ } کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ عرش پر قائم ہوا، جو اس کی شانِ عظمت وجلال اور اس کی شانِ قدوسیت کے شایانِ شان ہے، اور ہم اس کے { استویٰ علی العرش ﴾ پر ایمان لائے ہیں، جو اس کی شان کے لائق ہے اور اس کی تنزیہ وتقدیس پر بھی ایمان رکھتے ہیں، اس لیے ہم یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ خداوندِ قدوس مکان اور جہت سے اور تمکن واستقرار سے اور

(۱) معارف القرآن ادریسی: ۳/۱۸۷

اتصال وانفعال ---- سب سے پاک ہے۔ مکان اور جہت سب اس کی مخلوق ہے، وہ خداوند قدوس مکان اور زمان کے پیدا کرنے سے پہلے جس شان پر تھا، اسی شان پر زمان ومکان پیدا کرنے کے بعد بھی ہے۔(۱)

ایک اہم سوال وجواب

یہاں موقع کی مناسبت سے 'امداد الفتاویٰ' سے دو سوال وجواب پیش کیے جاتے ہیں، انھیں بھی بغور پڑھتے چلیں:

سوال: ہم میں سے ایک فریق کہتا ہے کہ خدا کسی مقام پر جلوہ فرما نہیں، وہ ہر جگہ موجود ہے۔ اب رہا یہ کہ کیسے اور کس طرح؟ یہ ہمارے ادراک سے باہر ہے۔ دوسرا فریق یہ کہتا ہے کہ حق تعالیٰ عرشِ معلّٰی پر ہے، ان میں سے کون سا فریق حق پر ہے؟

جواب: مسئلہ نازک ہے، اس لیے اس میں بحث بھی جائز نہیں، لیکن شوق دیکھ کر عرض کرتا ہوں کہ فریقِ اول کی مراد اگر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر جگہ مثل ہوا کے پھیلا ہوا ہے، تب تو غلط ہے، کیونکہ اس سے اللہ تعالیٰ کا مکانی ہونا لازم آتا ہے۔ اگر یہ مطلب ہے کہ اس کی تجلی، جیسی کہ اس کی ذاتِ منزہ کی شان کے زیبا ہے، عرش کے ساتھ خاص نہیں ---- سو یہ مسئلہ کسی نقلِ قطعی الدلالۃ یا کسی دلیل عقلی کے خلاف نہیں۔

اسی طرح فریقِ ثانی کی اگر یہ مراد ہے کہ عرش حق تعالیٰ کے لیے مکان اور حیز ہے، تو اس میں بھی نقص لازم آتا ہے، اور اگر یہ مراد ہے کہ اس کی کچھ خصوصیت عرش کے ساتھ ایسی ہے، جو ادراک وفہم سے عالی ہے، تو ظاہر نصوص کے موافق ہے۔ باقی اَسلم یہی ہے کہ اس میں گفتگو نہ کی جائے۔(۱)

اللّٰھم ارنا الحق حقاً وارزقنا اتباعہ، وارنا الباطل باطلاً وارزقنا اجتنابہ

---

(۱) امداد الفتاویٰ: ۶/۲۲، جامع الفتاویٰ: ۱/۱۱۰

مصادر و مراجع

۱۔القرآن الکریم۔

۲۔تفسیر ابن کثیر از علامہ عماد الدین ابن کثیر علیہ الرحمہ۔

۳۔تفسیر روح المعانی از علامہ سید محمود آلوسی علیہ الرحمہ۔

۴۔الدر المنثور از علامہ جلال الدین سیوطی علیہ الرحمہ۔

۵۔الجامع لأحکام القرآن از علامہ ابو عبد اللہ قرطبی علیہ الرحمہ۔

۶۔تفسیر مدارک التنزیل از علامہ نسفی علیہ الرحمہ۔

۷۔تفسیر جلالین از علامہ جلال الدین المحلی علیہ الرحمہ سیوطی علیہ الرحمہ۔

۸۔تفسیر مظہری از قاضی ثناء اللہ پانی پتی علیہ الرحمہ۔

۹۔تفسیر بیان القرآن از مولانا اشرف علی تھانوی علیہ الرحمہ۔

۱۰۔تفسیر معارف القرآن از مفتی محمد شفیع عثمانی علیہ الرحمہ۔

۱۱۔تفسیر معارف القرآن از مولانا ادریس کاندھلوی علیہ الرحمہ۔

۱۲۔تفسیر المنیر از شیخ وھبۃ الذھیلی۔

۱۳۔تفسیر انوار البیان از مفتی محمد عاشق الٰہی بلند شہری علیہ الرحمہ۔

۱۴۔توضیح القرآن از مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ۔

۱۵۔معجم مفردات القرآن از علامہ راغب اصفہانیؒ۔

۱۶۔صحیح مسلم از امام مسلم بن حجاج نیشاپوریؒ۔

۱۷۔سنن ابی داؤد از امام سلیمان بن اشعث سجستانیؒ۔

۱۸۔سنن النسائی از امام احمد بن شعیب النسائیؒ۔

۱۹۔فتح الملہم از مولانا شبیر احمد عثمانیؒ۔

۲۰۔بذل المجہود از مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ۔

۲۱۔قواعد العقائد از علامہ غزالیؒ۔

۲۲۔العقیدۃ النسفیۃ از علامہ سعد الدین تفتازانیؒ۔

۲۳۔مکتوبات امام ربانی از خواجہ احمد سرہندیؒ۔

۲۴۔تعریف عام بدین الاسلام از شیخ علی الطنطاوی۔

۲۵۔عقائد الاسلام از مولانا ادریس کاندھلویؒ۔

۲۶۔بیان الفوائد از مولانا مجیب اللہ قاسمی۔

۲۷۔فتاویٰ ارکانِ اسلام از شیخ صالح بن عثیمنؒ۔

۲۸۔جامع الفتاویٰ از مفتی مہربان علی بڑوتویؒ۔